ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3, 2024

اردو مضمون نگاری عہد بہ عہد: تحقیق و تجزیہ

URDU ESSAY WRITING AGE BY AGE: RESEARCH AND ANALYSIS

ڈاکٹر تنویر غلام حسین
اسسٹنٹ پروفیسر، سکول آف اردو، منہاج یونیورسٹی، لاہور

Dr. Taveer Ghulam Hussain
Assistant Professor School of Urdu, Minhaj University, Lahore
tanveerghulamhussain13@gmail.com

Abstract:
In the presented article, the evolution of Urdu essay writing has been reviewed. After the meaning and understanding of the essay, this genre has been discussed as a Literary genre and its different periods have been presented in chronological order. The trends that have developed over time in Urdu essay writing are described in this article. In addition to the themes, the introduction of the representative literature of each period is presented with explanations regarding their representative subjects. From the evolutionary review of essay writing, it is clear that all trends of Urdu Language Literature have been presented through this genre.

Key Words: *Urdu essay, Criticism, Elaborate, Conditions, Serious, The Spectator, The Tatler, Rationalism, literature, Wit, Leisure, Symbolism.*

مضمون جس کے لیے اُردو زبان میں انشائیہ کا لفظ بھی استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ انگریزی لفظ Essay کا مرادف ہے جو اصل میں فرانسیسی لفظ essai سے نکلا ہے اور جس کے لغوی معنی کوشش (effort) کے ہیں۔ اُردو مضمون کی طرح انگریزی کا لفظ Essay بھی کثیر المفہوم ہے۔ جس طرح علمی تحریروں کے لیے اُردو میں مقالہ کے علاوہ مضمون کی اصطلاح بھی مستعمل ہے، اسی طرح انگریزی میں مختلف علمی موضوعات پر لکھی گئی تحریروں کے لیے دوسرے الفاظ (پیپر، آرٹیکل) کے علاوہ Essay کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بلکہ انگریزی میں یہ لفظ نثر کے علاوہ بعض منظومات کے لیے بھی استعمال ہوتا رہا ہے (مثلاً پوپ کی نظمیں Essay on man یا Essay on Criticism)۔ تاہم انگریزی میں اس لفظ کا ایک ادبی صنف کے طور پر جو مفہوم وضع کیا گیا ہے، وہی مفہوم اُردو ادب کی اُس صنف کے لیے اختیار کیا جا سکتا ہے جس کی باقاعدہ ابتدا سر سید احمد خان سے ہوئی۔ مزید وضاحت کے لیے چند لغات سے مضمون کے مفہوم و معنی کو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں Essay کے معنی ایک ادبی اصطلاح کے طور پر یوں بیان کیے گئے ہیں:

> "A composition of moderate length on any particular subject, or branch of a subject ; originally implying want of finish, 'an irregular, indigested piece' (J.), but now said of a composition more or less elaborate in style, though limited in range". (1)

جانسن جن کا حوالہ مذکورہ بالا بیان میں دیا گیا ہے خود بھی ایک صاحبِ طرز مضمون نگار تھے۔ Essay کے بارے میں اُن کا خیال یہ ہے:

> "a loose sally of the mind, an irregular, indigested piece, not a regular and orderly performance".(2)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3, 2024

مضمون کی ماہیت کے بارے میں یہ بیانات کچھ زیادہ واضح نہیں ہیں۔ جانسن کا بیان تو اس کی ماہیت کو حل کرنے کے بجائے اور بھی الجھا رہا ہے۔ ان بیانات سے صرف دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ایک تو یہ کہ مضمون کو مختصر ہونا چاہیے، دوسری یہ کہ ناتمام اور نامربوط ہو۔یہ باتیں کسی علمی مضمون میں بھی ہو سکتی ہیں۔اس سے ادبی مضمون کی ماہیت متعین نہیں ہوتی۔انسائیکلوپیڈیا برٹینکا، کی تعریف کسی قدر واضح ہے، اگرچہ مکمل وہ بھی نہیں:

> "As a form of Literature, the essay is a composition of moderate length, usually in prose, which deals in an easy, cursory way with the external conditions of a subject, and, in strictness, with that subject only as it affects the writer".(3)

درج بالا تعریف کے مطابق ایک ادبی مضمون میں چار باتیں ضرور ہونی چاہییں ۔اول، مضمون درمیانی طوالت کا حامل ہو۔دوم، نثر میں ہو۔سوم، آسان اور سرسری انداز میں موضوع کے خارجی حالات بیان کرے۔چہارم، موضوع سے صرف اُس حد تک عہدہ برآ ہو جس حد تک کہ لکھنے والے کی ذات اس سے متاثر ہوئی۔یعنی اس میں شخصی زاویہ نظر پایا جائے۔ہمارے ہاں "مضمون" کا لفظ عربی سے آیا ہے اور عربی میں اس کے لیے "انشا" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو میں مضمون اور انشائیہ دونوں لفظوں کو انگریزی لفظ Essay کے مرادف کے طور پر ہی لیا جاتا ہے لیکن ان میں ایک معمولی سا فرق ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ عموماً غیر شخصی علمی و ادبی مضامین کے لیے مضمون، شخصی اور ہلکے پھلکے مضمون کے لیے انشائیہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر سیدہ جعفر بھی مضمون اور انشائیہ کے عمیق فرق کو اسی طور بیان کرتی ہیں کہ انشائیہ ایک ہلکا پھلکا مضمون ہوتا ہے جس میں انشائیہ نگار کی ذات نظر آتی ہے۔اس ضمن میں وہ لکھتی ہیں:

> "انشائیہ ایک طرح سے ادبِ لطیف اور رومانی طرزِ نگارش کا پروردہ ہوتا ہے وہ زندگی اور اس کے مسائل کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔وہ حیات کے رنگا رنگ جلوؤں کا تماشاہی ہوتا ہے اور انھیں اپنی رنگین عینک سے دیکھتا اور پرکھتا ہے۔۔۔مضمون میں معلومات کا بھی دخل ہوتا ہے، اور انشائیہ میں محض تاثرات کی کارفرمائی۔۔۔مضمون نگاری میں خیال انگیزی پائی جاتی ہے اور انشائیہ میں تخیل پرستی مضمون نگار پاسبانِ وقل کی معیت سے گھبراتا نہیں انشائیہ نگار 'دلِ وحشی' کا مطیع و فرماں بردار ہوتا ہے۔۔۔مختصر یہ کہ مقالہ، مضمون اور انشائیہ بظاہر مشابہہ ہوتے ہوئے بھی اپنے ادبی خدوخال کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف محسوس ہوتے ہیں۔"(4)

یہاں ہمارا موضوع براہِ راست مضمون، جسے انگریزی میں Essay کہا جاتا ہے، سے تعلق رکھتا ہے۔مضمون کے حوالے سے درج بالا تعریفوں میں جن امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان کے علاوہ چند اور باتیں بھی قابلِ ذکر ہیں جن کا احاطہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے کیا ہے۔اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> "جہاں تک مضمون کے موضوع کا تعلق ہے، ایک مضمون نگار کسی بھی شے کو، جو اُسے متاثر کرے، اپنا موضوع بنا سکتا ہے۔حیات و کائنات کے وسیع تر مظاہر، آسمان سے زمین تک اور رائی سے پربت تک ہر چیز مضمون کا موضوع بن سکتی ہے۔ایک مضمون نگار اپنے ماحول کا مبصر اور زندگی کا نقاد ہوتا ہے اور ایک صاحب فن کی حیثیت سے اُس کی نگاہ باریک بین معمولی معمولی چیزوں میں بڑے بڑے سربستہ اسرار و رموز کا مشاہدہ کرتی ہے۔اُس کے لیے کوئی چیز بھی پیش پا افتادہ نہیں ہوتی۔وہ گل و گلزار سے محظوظ ہو سکتا ہے تو خارِ مغیلاں سے بھی متاثر ہو سکتا ہے۔وہ زندگی کے عظیم مسائل سے لے کر چھوٹی چھوٹی باتوں میں یکساں دلچسپی لیتا ہے، اور نہ صرف دلچسپی لیتا ہے بلکہ اُن کی مصوری کرتا ہے اور اُن کے دلچسپ مرقعے اور جاذب توجہ نقشے بنا کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان معمولیات میں ایک حسن اور کشش پیدا ہو جاتی ہے۔اس لحاظ سے ایک مضمون نگار کو متفرق نویس بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ مختلف اشیا سے وقتاً فوقتاً متاثر ہو کر انھیں اپنا موضوع بناتا ہے۔ موضوع کے بعد اظہار و بیان کا مسئلہ مضمون میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔موضوع خواہ معمولی ہو یا غیر معمولی ایک مضمون نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسے ہلکے پھلکے انداز اور دوستانہ رنگ میں پیش کرے۔ایسے، جیسے وہ اور قاری گھریلو فضا میں بیٹھے ہوئے بے تکلفی کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہوں۔بات چیت کا یہ بے تکلفانہ انداز ایک مضمون کی کامیابی کے لیے ازبس ضروری ہے۔موضوع خواہ کتنا ہی سنجیدہ کیوں نہ ہو، اور اس کی معلوماتی حیثیت خواہ کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو، اس کے اظہار میں ہلکا پھلکا پن اور دل کشائی نہایت ضروری ہے، ورنہ مضمون کی روح لطیف سخت مجروح ہو گی اور مضمون اپنی تاثیر بھی کھو بیٹھے گا۔"(5)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3, 2024

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں کہ مضمون کا مختصر ہونا یعنی اختصار اور ناتمامی ہونی بھی یقیناً ایک اچھے مضمون کے لیے ضروری ہے۔ لیکن محض ان دو شرائط سے کوئی مضمون ادب کی حدود میں نہیں آسکتا۔ اسی لیے انھوں نے مضمون کو دو اقسام میں منقسم کیا ہے :

1۔ بے قاعدہ مضمون

2۔ باقاعدہ مضمون

بے قاعدہ مضمون میں مضمون کی بعض شرائط کا پاس ہوتا ہے، مثلاً بعض مضمون مختصر بھی ہوتے ہیں اور ناتمام بھی، لیکن ان میں علم کی کسی نہ کسی شاخ (مثلاً سائنس، فلسفہ، اخلاق ،تاریخ، تنقید وغیرہ) کو سنجیدہ اور منطقی پیرائے میں بیان کیا گیا ہوتا ہے۔ مضمون تاثرات اور تخیلات کے بجائے ٹھوس معلومات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس قسم کے مضامین کو ہم علمی مضامین کہہ سکتے ہیں۔ باقاعدہ مضمون اُسے کہا جا سکتا ہے جس میں معلومات کے علاوہ لکھنے والے کے جذبات واحساسات، تاثرات اور تخیلات بھی شامل ہوں اور انداز بیان منطقیانہ ہونے کے بجائے بے تکلفانہ گفتگو کا حامل ہو جسے دوسرے لفظوں میں 'Fireside chat of a Philosopher' بھی کہا گیا ہے۔(6)

جب ہم مضمون کو ایک ادبی صنف کے طور پر زیر بحث لاتے ہیں تو اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں ادبیات کی ایک بنیادی قدر دل کشائی اور مسرت زائی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگر کسی مضمون میں سب کچھ ہے اور یہی بات نہیں، تو اس کی ادبی حیثیت کو بجا طور پر مشکوک قرار دیا جا سکتا ہے۔ ادبیات (شاعری و نثر) فنونِ لطیفہ کی اہم شاخیں ہیں۔ سر جان ڈرنک واٹر نے یہ بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ شاعری میں جو حیثیت غنائی نظم کی ہے وہی حیثیت نثر میں مضمون کو حاصل ہے۔ یعنی ایک غنائی نظم (Lyric) اور مضمون (Essay) میں بڑی مشابہت ہے۔ جس طرح ایک غنائی نظم اصولاً کسی مرکزی جذبے یا تاثر کے تحت وجود میں آتی ہے، اسی طرح مضمون میں جذبہ اور تخیل کام کرتا ہے۔ مصنف کسی خارجی تحریک سے متاثر ہوتا ہے اور اسی مرکزی تاثر کے گرد وپیش اس کی تخیلی قوت اپنا تانا بانا بن دیتی ہے۔ (7) الیگزنڈر سمتھ اپنے مقالے On the Writing of Essays میں مضمون کو غنائی نظم سے مشابہت دیتے ہوئے اس کے تخلیقی عمل کو ایک دلچسپ تمثیل کے ذریعے واضح کرتے ہیں:

> "The essay as a literary form, resembles the lyric, in so far as it is moulded by some central mood-whimsical, serious, or satirical. Give the mood, and the essay, from the first sentence to the last, grows around it as the cocoon grows around the silkworm .(8)

مضمون نگاری کے ابتدائی نقوش اور اس کے آغاز وارتقا کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس ضمن میں طباعت کی سہولتوں اور صحافت رسائل و جرائد کے اجرا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس میں مصنف اور قاری کا رابطہ دوسری اصناف ادب کے مقابلے میں کچھ زیادہ ضروری ہے اور اس رابطے کے لیے طباعت اور صحافت اہم ترین وسیلے ہیں۔ چنانچہ طباعت کی سہولتوں کے ساتھ ہی یہ صنفِ ادب باقاعدہ طور پر معرضِ وجود میں آتی ہے اور صحافت کے فروغ کے ساتھ ساتھ اس کو بھی ترقی نصیب ہوتی ہے۔ مغرب میں اس صنف ادب کے بانی ایک فرانسیسی رئیس مانتین (Montaigne) تھے جنھوں نے سادہ و سلیس زبان اور گپ شپ کے انداز میں ۱۵۷۱ ءمیں مضمون نویسی کا سلسلہ شروع کیا۔ مانتین کے یہ مضامین ۱۵۸۰ ء میں بورڈو سے اور ۱۵۸۸ ء میں پیرس سے طبع ہو کر منظرِ عام پر آئے اور اس طرح ادبی دنیا ایک نئی اور دلکش صنفِ ادب سے روشناس ہوئی۔ انگریزی کے پہلے مضمون نگار فرانسس بیکن (۱۵۶۱ء۔ ۱۶۲۷ء) تھے جن کا پہلا مجموعہ مضامین ۱۵۹۷ ء میں طبع ہوا۔ اس کے بعد مغرب میں طباعت و صحافت کی سہولتوں کے ساتھ یہ صنفِ ادب بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ انگریزی ادبیات میں بیکن کے بعد ڈینیل ڈیفو (ء۔ ۱۷۳۱ء) ،جان سیلڈن (۱۵۸۴ ء۔ 4۱۶۵ء)، ڈرائیڈن (۱۶۳۱ ء۔ ۱۷۰۰ء) سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ سر رچرڈ اسٹیل (۱۶۷۲ ء۔ ۱۷۲۹ء) اور جوزف ایڈیسن (1672ء۔1719ء) تک پہنچتا ہے جن کے پرچوں ٹیٹلر (The Tatler) اور اسپکٹیٹر (The Spectator) سے متاثر ہو کر سر سید احمد خان نے اپنے زمانۂ قیامِ انگلستان (۱۸۶۹ ء۔ ۱۸۷۰ء) میں تہذیب الاخلاق کے اجرا کا فیصلہ کیا تھا۔ گویا اردو ادب میں مضمون کی صنف مغرب کے جن ادیبوں سے متاثر ہو کر شروع ہوئی وہ (بقول سر سید لنڈن کے پیغمبر اور سولیزیشن کے دیوتا) سر رچرڈ اسٹیل اور مسٹر اڈیسن تھے۔ اگرچہ ان کے بعد بھی اس صنف کو بہت فروغ ملا، اور ہمیں سوفٹ (1667ء۔1745ء) ، جانسن (۱۷۰۹ء۔ ۱۷۸۴ء) ، گولڈ سمتھ (۱۷۲۸ء۔ 4۱۷۷ء)، لی ہنٹ (۱۷۸۴ء۔ ۱۸۵۹ء)، چارلس لیمب (۱۷۷۵ ء۔ ۱۸۳۴ء)، ولیم ہزلٹ (۱۷۷۸ ء۔ ۱۸۳۰ء) وغیرہ بڑے بڑے مضمون نگاروں کا سلسلہ نظر آتا ہے۔(9)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3, 2024

انگریزی کے بعد مضمون نگاری یاانشاپردازی کی ابتداعربی زبان میں عبدالحمید کے مضامین سے ہوئی۔فارسی کے قدیم ادب میں بھی ہمیں مضمون نگاری کے نمونے ملتے ہیں جن کے لیے رسائل کا لفظ استعمال کیا جاتاہے۔یہاں عربی اور فارسی زبان میں مضمون نگاری کا ارتقا ہمارا موضوع نہیں ہے لہٰذا ہم براہِ راست اردو مضمون نگاری کی طرف آتے ہیں۔اردو مضمون نگاری کے ابتدائی نمونے ہمیں اردو کے ابتدائی نثر پاروں میں ہی نظر آتے ہیں۔ملا وجہی کی "سب رس" میں ہمیں مضمون نما تحریریں ملتی ہیں لیکن انھیں ہم باقاعدہ مضامین کے ذیل میں پیش نہیں کر سکتے ہیں۔

اردو میں طباعت کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کی ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کے مطبع ہندوستانی سے ہوا۔فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی تصانیف میں ہمیں مضمون نما تحریریں ملتی ہیں۔مثلاً شیر علی افسوس کی "آرائشِ محفل" میں مضامین کا انداز نظر آتا ہے۔فورٹ ولیم کالج کے علاوہ رجب علی بیگ سرور کی "شبستانِ سرور"، "فسانۂ عجائب" اور اسی طرح فقیر محمد گویا کی "بُستانِ حکمت" کے دیباچہ کو مضمون کا انداز قرار دیا جاسکتا ہے۔علاوہ ازیں مختلف کتب پر جو تقریظیں لکھی گئیں، مثلاً غلام غوث بے خبر اور غالب کی تقریظیں کافی معروف ہیں۔ان میں بھی مضمون نگاری کا انداز نظر آتا ہے۔اسی عرصے میں برِ صغیر میں مقامی صحافت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔یہی زمانہ اردو کے نثری ادب کے فروغ کا زمانہ بھی تصور کیا جاتا ہے۔ صحافت کے حوالے سے ۱۸۲۲ ءمیں اردو کا پہلا اخبار "جامِ جہاں نما" کلکتے سے جاری ہوا۔دہلی سے ۱۸۳۷ ءمیں مولوی محمد باقر کا "اردو اخبار" (جس میں مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا) اور سید محمد کا "سید الاخبار" (جس میں سرسید کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا) جاری ہوئے۔دہلی کالج کے ماسٹر رام چندر نے ۱۸۴۵ ءمیں پندرہ روزہ "فوائدِ الناظرین" جاری کیا اور ستمبر ۱۸۴۷ ءسے ایک ماہوار رسالہ "خیر خواہ ہند" کے نام سے جاری کیا جس کا نام نومبر ۱۸۴7 ءسے بدل کر "محبِ ہند" رکھ دیا گیا۔یہ اردو کا پہلا علمی وادبی رسالہ تھا جو کم و بیش پچاس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ماسٹر رام چندر کو ایک لحاظ سے اردو مضمون نویسی میں سرسید کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ماسٹر رام چندر کے سامنے بھی اسپیکٹیٹر "کا تصور موجود تھا۔ چنانچہ وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس کا ذکر کرتے ہیں" ہم اسپیکٹیٹر کے ڈھنگ پر کام شروع کرنے کا بھی حوصلہ رکھتے تھے" ۔(10)ماسٹر رام چندر کی اولیت کے ضمن میں سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

> "رام چندر اردو کے وہ پہلے مصنف ہیں جنھوں نے مغربی ادبیات سے متاثر ہو کر ان کی جاندار روایات اور توانا ادبی قدروں کو اپنانے اور انھیں اردو زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔رام چند کے نئے خیالات اور نظریات کی وجہ سے بقوم مولوی عبدالحق لوگ انھیں "بدمذہب اور ملحد" سمجھنے لگے تھے۔دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب کی عقلیت (Rationalism) دوسرے تمدنی میلانات کے ساتھ ہندوستان کے فلسفۂ زندگی کا جزو بنتی جارہی تھیں۔رام چند کے مضامین کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس اصلیت کا حقیقت نگاری (Realism) اور عقلیت کی نمائندگی کرتے ہیں جو یورپ اور انگلستان کے صنعتی انقلاب کے نتیجے کے طور پر مغرب سے ہندوستان پہنچ رہی تھی اور مشرق کی تنگ نظری جہالت اور توہم پرستی سے ٹکر لے رہی تھی۔جدید مغربی علوم اور خصوصاً سائنسی علوم سے رام چندر کی غیر معمولی دلچسپی بھی ان کی عقلیت کا بہترین ثبوت ہے۔"(11)

ماسٹر رام چندر نے "فوائدِ الناظرین "اور محبِ ہند" میں مختلف سائنسی، علمی، اخلاقی، اصلاحی، سیاسی، سماجی اور معاشی موضوعات پر بیشمار مضامین لکھے ہیں۔مثلاً اخلاقی و اصلاحی مضامین کے سلسلے میں استقلال، رشوت، علم اخلاق، اعتدال، کفایت شعاری، سخاوت، سخاوت بیجا، سستی، مکاری، خوشامد، غرور، صبر، بیاری، حسد، غصہ، بے رحمی عبادت، شجاعت، خوش اخلاقی، تعصب، ہمدردی اور مروت، دل کی صفائی، برداشت، عادت، غیبت، اخلاق، امید، ریاضت، بلند نظری (12) وغیرہ زندگی کی عام حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں۔لیکن بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ماسٹر رام چندر کے ان مضامین کو ہم باقاعدہ ادبی مضمون نہیں کہہ سکتے۔زیادہ سے زیادہ ہم انھیں بے قاعدہ مضامین کی صف میں شمار کر سکتے ہیں۔کیونکہ انھوں نے ان اخلاقی و اصلاحی موضوعات کو علمی انداز میں پیش کیا ہے۔ادبی انداز میں پیش کرنا شاید ان کا مقصود بھی نہیں تھا اور غالباً وہ اس پر قادر بھی نہیں تھے۔ماسٹر رام چندر کی نثر سراسر علمی نثر ہے جس میں وضاحت اور صراحت ان کے پیش نظر رہتی ہے، اور یہ علمی نثر بھی ابھی تجربہ گاہ کی منزل سے گزر رہی تھی۔(13)ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی مضمون نویسی میں ماسٹر رام چندر کی تقدیمی حیثیت کو تو لائقِ احترام خیال کرتے ہیں لیکن جس صنفِ مضمون کی جو وہ وضاحت فرماتے ہیں، اس کے پیش نظر ماسٹر صاحب کی حیثیت ایک علمی مقالہ نگار کے طور پر تو سمجھ میں آتی ہے، ادبی مضمون نگار کے طور پر نہیں۔اس حوالے سے ان کا اقتباس دیکھیے :

> "اردو نثر کی تاریخ میں رام چندر کی یہ تقدیمی حیثیت بھی لائق سے احترام ہے کہ انھوں نے اردو کو مضمون یعنی 'ایسے' روشناس کرایا اور ان سائنسی عنوانات پر مقالات لکھے جن کی کمی ہم آج بھی محسوس کرتے ہیں۔اس زمانہ میں ہمارے شوق کی واماندگی نے شاعری اور تصوف کی پناہیں ڈھونڈھ لی

تھیں،اور یہ دونوں سرحد ادراک سے پرے اور سائنسی حقائق سے دور تھیں۔اسی لیے اردو نثر صدقِ بیان سے عاری تھی اور اس کا ذخیرۂ الفاظ تنگنائے غزل تک محدود تھا۔رام چندر کے مضامین میں نثر کی وضاحت اور راستی تو ہے لیکن اس کا حسن تناسب نہیں۔اس وقت سائنس پر مضامین لکھنے کے معنی دراصل ایک نئی زبان کے وضع کرنے کے تھے جس سے ہمارے کان ناآشنا تھے۔اس لیے ان سے قواعد کی پابندی، زبان کے چٹخارہ اور اسلوب کی دلآویزی کی توقع رکھنا عبث ہے۔"(14)

گویا خواجہ احمد فاروقی بھی ماسٹر رام چندر کو ایک علمی مضمون نگار کے طور پر تسلیم کرتے ہیں،ادبی مضمون نگار کے طور پر نہیں،اس سے ثابت ہوا کہ ان کی نثر علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے تجربے کر رہی تھی۔اس لیے اس میں کسی ادبی نوع کی تلاش عبث ہے۔غرض ماسٹر رام چندر نے اصلاحی نقطۂ نظر سے معاشرتی زندگی کے جن چھوٹے چھوٹے مسئلوں کو اپنا موضوع بحث بنایا،ان سے ان کی ایک تقدیمی حیثیت مسلم ہے۔یہی مسائل آگے چل کر سر سید کا موضوع بھی بنے تھے۔لیکن سر سید کے سامنے اصلاحی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ ایک واضح ادبی نقطۂ نظر بھی موجود تھا جس پر وہ کسی حد تک عمل پیرا ہو سکے۔لیکن ہم روایت کے بیان میں ماسٹر رام چندر کو محدود معنوں میں صنفِ مضمون نگاری میں سر سید کا پیش رو کہہ سکتے ہیں۔

سر سید کی مضمون نگاری کے کسی حد تک ایک اور پیش رو مرزا اسد اللہ خان غالب بھی ہیں۔ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار غالب کو ایک مضمون نگار کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہوئے انھیں سر سید کا پیش رو اور راہنما قرار دیتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ غالب نے کئی اہم تقریظیں بھی تحریر کیں لیکن ان کا اردو میں جاندار نثری سرمایہ ان کے خطوط ہیں۔اگرچہ غالب نے بعض نجی وجوہ کی بنا پر سیدھے سادے اردو میں خطوط نویسی کا سلسلہ شروع کیا اور ان کی جدت پسند طبیعت نے سادگی کی اس راہ پر بھی بہت جلد پرکاری کا وہ رنگ اختیار کر لیا جس کی وجہ سے ان کے نجی خطوط ادبی نقطۂ نظر سے گوناگون خصوصیات کے حامل بن گئے۔غالب نے اپنے خطوط میں مراسلت کے بجائے مکالمت کا جو انداز اختیار کیا اس نے ان کی نثر میں حیات آفرین حسن و دل آویزی پیدا کر دی۔غالب خط لکھتے ہوئے اپنے آپ کو ایک ایسے مجلسی ماحول میں پاتے ہیں جس میں وہ اور مکتوب الیہ آمنے سامنے بیٹھے گفتگو کر رہے ہوں۔وہ اپنے مکتوب الیہ سے اس طرح خطاب کرتے ہیں جیسے دوستانہ ماحول میں باہم تبادلۂ خیال ہوتا ہے،راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں،ایک دوسرے کا دکھ درد بتایا جاتا ہے۔بے تکلفانہ گفتگو کا یہ پیرایہ (جس میں کبھی کبھی مکالمے بھی آجاتے ہیں اور مجلسی زندگی کی جزئیات اور ماحول کے دلکش مرقعے،غالب کے بعض خطوط کو افسانے اور انشائیے کے قریب قریب لے آتے ہیں۔جس ادبی اسلوب نگارش کی توقع ایک مضمون نگار سے کی جاسکتی ہے،وہ یقیناً غالب کے ہاں موجود ہے۔تاہم غالب کے خطوط باقاعدہ مضمون نہیں کہے جاسکتے اور نہ ہی اس نقطۂ نظر سے انھیں لکھا گیا ہے۔البتہ ایک مضمون نگار کے لیے غالب کا یہ زندہ و دلکش انداز اچھا راہنما بن سکتا ہے اور سر سید احمد خان اس انداز سے متاثر بھی ہوئے جس کا ثبوت ان کے چند مضامین (مثلاً سراب حیات،آدم کی سرگزشت وغیرہ) سے ملتا ہے۔(15)اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی بھی غالب کی اردو نثر کے امکانات کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"۔۔۔غالب کے خطوط کی اس نثر میں کتنا تنوع ہے اور کتنے امکانات اُبھر کر سامنے آرہے ہیں۔یہ نثر کسی بھی موضوع کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی قوت وصلاحیت رکھتی ہے۔غالب نے اسی طرزِ نظر میں علمی و ادبی موضوعات کو بیان کیا ہے اور تنقیدی نثر کے امکانات کو راستہ دکھایا ہے۔"(16)

سر سید احمد خان کی مضمون نگاری پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ مضمون نگاری کے ارتقا میں رام چندر اور غالب کے علاوہ جن احباب نے اہم کردار ادا کیا ان کے نام، موضوعاتِ مضامین اور جن رسائل میں چھپتے رہے، کا مختصر تذکرہ کر دیا جائے۔اس ضمن میں رام چندر کے تتبع میں ذکاء اللہ کا نام اہم ہے۔ان کے مضامین زیادہ تر انگریزی ادب سے ماخوذ اور اصلاحی مقصد سے بھرپور تھے اور رسالہ "حسن"، "معارف" اور "الناظر" میں شائع ہوتے تھے۔ان کے بعد دوسرا اہم نام محمد حسین آزاد کا ہے۔ان کی مضمون نگاری بھی بہت حد تک مغربی ادب پر انحصار کرتی ہے۔آزاد کے ہاں بھی اصلاحی پہلو مقدم تھا لیکن ان میں یہ پہلو رمزیہ اور تمثیلی انداز لیے ہوئے تھا۔انھوں نے اپنے مضامین میں اصلاحی مقاصد کو تمثیل نگاری کے ذریعے بہت عمدگی سے برتا تھا۔بقول سیدہ جعفر:

"آزاد کا طرزِ نگارش قدیم اور جدید دونوں اسالیب کا ایک خوشگوار اور حسین امتزاج ہے۔آزاد مغرب کی ترقی،اس کے مادی اقتدار اور ادبی برتری سے متاثر ضرور تھے لیکن جس ماحول میں ان کے مزاج اور ذہن نے نشو نما پائی تھی وہ مشرقی تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد کے اسلوب میں جدت طرازی، انفرادیت اور ایک نئی لے کے باوجود مشرقی انشاپردازی کے قدیم معیاروں سے وابستگی کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔"(17)

حرف و سخن HARF-O-SUKHAN Urdu Research Journal of PAKISTAN
ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3, 2024

محمد حسین آزاد کے بعد مضمون نگاری کے حوالے سے اہم نام مولوی نذیر احمد کا ہے۔ان کے مضامین بھی ہندوستان کے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ان کے مضامین کا ایک مجموعہ سیدہ جعفر کی تحقیق کے مطابق شوق امر تسری نے لاہور سے "مولوی نذیر احمد کے علمی مضامین" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔اس کے علاوہ بشیر احمد دہلوی نے "لختِ جگر" کے عنوان سے صاحبِ طرز ادبا کے مضامین شائع کیے ان میں بھی نذیر احمد کے مضامین موجود ہیں۔(18) مولوی نذیر احمد کے مضامین میں نمایاں پہلو اصلاحِ معاشرہ ہے۔انھوں نے اپنے مضامین میں اسلامی عقائید اور اس کے تفوق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اردو مضمون نگاری کے ارتقا میں علی گڑھ تحریک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ تحریکِ علی گڑھ کے روحِ رواں سر سید احمد خان (ان کا مفصل ذکر آخر میں پیش کیا جائے گا) کے علاوہ "تہذیب الاخلاق" کے پلیٹ فارم سے جن ادبا و علمانے اردو مضمون نگاری کو دوام بخشا ان میں چراغ علی کا نام اہم ہے۔ان کے مضامین میں مذہبی رنگ زیادہ نمایاں تھا۔انھوں نے اپنے مضامین میں زیادہ تر مغربی مفکرین کی دینِ اسلام کے حوالے سے پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔چراغ علی کو لاطینی، یونانی، فارسی ، عربی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے مضامین میں دینِ اسلام کا باقی مذاہب سے موازنہ کر کے اسلام کی حقانیت کو پیش کیا ہے۔ تحریکِ علی گڑھ کے پلیٹ فارم سے اردو مضمون نگاری کی روایت کو مضبوط کرنے والی ایک اہم شخصیت محسن الملک کی ہے۔انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے بقول سیدہ جعفر: اس فلسفے ، تمدن اور اس سیاسی اور عمرانی آدرش کی تفسیر اور تشریح کی جس کو اہلِ ملک سے مانوس بنانے کی کوشش میں سر سید اپنے دل و دماغ اور قلم کی ساری توانائیوں کی بازی لگا چکے تھے۔(19) اس دور کی دوسری اہم شخصیت وقار الملک کی ہے۔انھوں نے بھی سر سید کے افکار کی پیروی کرتے ہوئے سیاسی اور سماجی مسائل پر مضامین تحریر کیے۔ان کے مضامین اس دور کے ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

اردو مضمون نگاری کے ارتقا میں ایک اہم نام حالی کا بھی ہے۔حالی نے اپنے مضامین سے لوگوں کے اندر عزم، حوصلہ اور توانائی کے جوہر ابھارنے کی کوشش کی۔اس حوالے سے ان کے مضامین "قرونِ اولیٰ کی حق گوئی و حق پسندی"، "مسلمانوں میں مسئلہ خیرات"، "بدگمانی" کو بطور مثال دیکھا جاسکتا ہے۔حالی نے بھی معاشرے کی اصلاح کے لیے انھی خیالات کو اپنے مضامین کا حصہ بنایا جو سر سید کے پیشِ نظر تھے لیکن سر سید کی نسبت حالی نے اپنے مضامین کو بہت عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین سادگی، سلاست اور سنجیدگی کا منبع ہیں۔حالی کے علاوہ سر سید کے سماجی اور تعلیمی رجحانات کی پیروی میں مضامین لکھنے والوں میں قاری سرفراز حسین کا نام بھی شامل ہے۔ان کا زیادہ تر میلان معاشرے کے اقتصادی اور ثقافتی پہلوؤں کو اجاگر کرنا تھا۔انھوں نے اپنے عہد کے مسائل کا جائزہ لینے کے بعد اپنے مضامین کے ذریعے ان کو بہتر کرنے کی بھرپور کوشش کی۔انھوں نے مضمون نگاری میں مکالماتی اور ڈرامائی انداز کو متعارف کروایا۔ڈرامائی طرز پر لکھے گئے ان کے مضامین میں "امیر غریب"، "زندگی کی بہار" اور "دل کا عجائب خانہ" اہم ہیں۔سر سید کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے مضمون نگاروں میں ایک نام اسماعیل میرٹھی کا بھی ہے۔اگرچہ ان کا اولین حوالہ بچوں کی شاعری کے حوالے سے ہے لیکن انھوں نے بچوں اور نوجوانوں کی تدریس کے لیے ہلکے پھلکے مضامین بھی تحریر کیے ہیں۔یہ مضامین معاشرے کی اصلاح کے نقطۂ نظر سے بصیرت افروز ہیں۔ان کے مضامین کا مرکزی نکتہ اصلاحِ معاشرہ ہے۔اس حوالے سے "حفظِ صحتِ روحانی"، "پھر کوشش کرو"، دلیری اور جرات"، معافی اور انتقام" اور "وقت سرمایہ ہے" اصلاحِ معاشرہ کے تناظر میں مثال کے طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

ادبیاتِ اردو میں مضمون نگاری کے روحِ رواں سر سید احمد خان کی تصنیفی زندگی کا آغاز ۱۸۳۸ء کے قریب ہو گیا تھا۔۱۸۵۷ء تک ان کی حیثیت ایک محقق اور مصنف کی تھی اور ان کے موضوعات زیادہ تر علمی نوعیت کے تھے۔۱۸۵۷ء کے بعد وہ ایک معاشرتی مصلح کی حیثیت سے منظرِ عام پر آئے اور اپنے اجتماعی مقاصد کی پیش رفت کے لیے مختلف اخبار مثلاً سید الاخبار اور سائنٹفک سوسائٹی اخبار میں لکھنے لگے۔ان کی مضمون نگاری کے آغاز کے حوالے سے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:

"سید الاخبار کے بعد سائنٹفک سوسائٹی اخبار (اجراء ء بعد میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ) سر سید کی صحیفہ نگاری کے لیے اہم ذریعے تھے۔ اس صحیفہ نگاری نے سر سید میں متفرق نویسی کا جو وصف پیدا کیا، وہ آگے چل کر تہذیب الاخلاق کی مضمون نگاری میں بہت ممد ثابت ہوا۔اپریل ۱۸۶۹ء میں سر سید احمد خان اپنے فرزند سید محمود کے ہمراہ انگلستان گئے اور وہاں ڈیڑھ برس کے عرصہ قیام میں دیگر علمی و تعلیمی مشاہدات کے علاوہ انھیں ادبی رسائل کی قوت کا اندازہ ہوا خصوصاً ایڈیسن اور اسٹیل کے رسائل کی معاشرتی اصلاحی خدمات سے وہ بہت متاثر ہوئے۔انھیں سترھویں اور اٹھارویں

صدی کے انگلستان کی معاشرتی زندگی اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی معاشرتی زندگی میں بہت سی مماثلتیں نظر آئیں۔اس سلسلے میں مذکورہ بالا ادیبوں کے ان اقوال زریں نے انھیں بہت متاثر کیا جو انھوں نے ادب کی اجتماعی حیثیت کے بارے میں کہے تھے:

1. To establish a rational standard of conduct in morals, manners, art and literature.

2. To enliven morality with Wit, and to temper wit with morality.

سر سید احمد خان نے اپنے اجتماعی نظریات میں عقلی معیار اور "اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈالنے اور خوش طبعی کو اخلاق سے ملانے "(مقاصد تہذیب الاخلاق صفحہ 8) کے تصور کے تحت ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر کے طرز پر ایک اصلاحی ادبی جریدہ "تہذیب الاخلاق" نکالنے کا فیصلہ انگلستان ہی میں کر لیا اور ضروری انتظامات بھی وہیں مکمل کر لیے۔اکتوبر ۱۸۷۰ء میں وہ ہندوستان پہنچے اور ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو "تہذیب الاخلاق" کا پہلا شمارہ منظر عام پر آگیا ۔یہاں سے سر سید احمد خان کی مضمون نگاری کا با قاعدہ آغاز ہوتا ہے اور یہ صنف ادب باضابطہ طور پر اردو ادب میں داخل ہوتی ہے۔"(20)

تہذیب الاخلاق میں سر سید احمد خاں نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے موضوعات کے اعتبار سے ان کے مضامین کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

1۔مذہبی ۲۔ تعلیمی وسیاسی وغیرہ 3۔معاشرتی مسائل مجلسی آداب وتہذیب اخلاق

تیسری قسم کے مضامین ادبی نقطۂ نظر سے قابل ذکر ہیں۔ پہلی اور دوسری قسم کے مضامین کو علمی مقالات کہا جا سکتا ہے،ادبی لحاظ سے انھیں زیر بحث لانا سعی لاحاصل ہے۔ مجلسی آداب اور تہذیبِ اخلاق کے متفرق موضوعات پر سر سید کے مضامین میں بعض باتیں ایسی ہیں جو مضمون (Essay) کے معیار کے مطابق ہیں۔ مثلاًان مضامین کا اختصار، دوسرے ان مضامین کی ناتمامی اور جزویت۔ سر سید کے ان مضامین میں کسی مسئلے کے جملہ پہلوؤں کے بجائے کسی ایک رخ پر سر سری نظر ڈالی گئی ہے جو ادبی مضمون کا ایک عام وصف ہے۔ لیکن ان چند باتوں کے سوا سر سید کے بیشتر مضامین ان اوصاف سے محروم ہیں جو باقاعدہ ادبی مضمون کے لیے ضروری سمجھے گئے ہیں۔ مثلاًیہ کہ ایک ادبی مضمون کسی جذباتی تحریک کا مقتضی ہوتا ہے۔اس میں ٹھوس معلومات اور خشک منطقیت کے بجائے خیال انگیزی ہوتی ہے جو مسرت افزائی کا باعث بنتی ہے۔ مصنف اور قاری کے درمیان دوستانہ بے تکلفی اور اعتماد کا ماحول ہوتا ہے۔ سر سید کے چند مضامین باقاعدہ ادبی مضمون قرار دیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً" امید کی خوشی"، " گزرا ہوا زمانہ"، "بحث وتکرار" اور "سرابِ حیات" وغیرہ ۔یہ مضامین کسی نہ کسی جذباتی تحریک سے اُبھرے ہیں۔ان میں معلومات یقینی کے بجائے تخیلات کا غلبہ ہے اور پھر ان میں خیالات کی تہیں بڑے بے تکلفانہ انداز میں کھلتی گئی ہیں۔یعنی الیگزنڈر سمتھ کی دی ہوئی مثال کے مطابق ان مضمونوں میں مرکزی جذبہ یا موڈ موجود ہے اور مضمون ریشم کے کیڑے کی طرح اپنا تار و پود اس کے گرد بکھیرتا جاتا ہے تا آنکہ ایک ایسے مقام پر پہنچ کر مضمون رک جاتا ہے جہاں جذبہ نرم ہوتے ہوتے بالکل پر سکون ہو جاتا ہے۔ قاری ان مضامین کو پڑھتے وقت محظوظ بھی ہوتا ہے اور آخر میں مصنف اور قاری ہم خیال ہو کر اٹھتے ہیں۔(21) سر سید کے ان مضامین سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ نہ صرف باقاعدہ ادبی مضمون کے فنی تقاضوں سے باخبر تھے بلکہ ان فنی تقاضوں پر عمل پیرا ہونے کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔

مضمون نگاری کے سلسلے میں سر سید کی ذہنی اُپج کا تجزیہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ سر سید نے ایک جگہ اپنی اس آرزو کا اظہار یوں کیا ہے "بلاشبہ ایک ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر کی یہاں ضرورت تھی۔ سو خدا کا شکر ہے کہ یہ پرچہ انھی کے قائم مقام مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں جاری ہوا۔ مگر افسوس کہ یہاں کوئی اسٹیل اور اڈیسن نہیں ہے۔"اس تاسف میں یہ آرزو پوشیدہ ہے کہ سر سید بھی اس بات کے خواہاں تھے کہ یہاں کوئی اسٹیل اور اڈیسن ہو اور انہی کے انداز پر معاشرتی قباحتوں کو دلچسپ پیرائے میں بے نقاب کر کے اصلاح کا فرض انجام دے اس طرح اخلاق اور خوش طبعی کا پیوند لگے اور ادب اور اصلاح کے تقاضے بیک وقت پورے ہو جائیں۔یہ کردار شاید وہ خود انجام دے بھی لیتے لیکن وہ اپنے ماحول اور حالات سے مجبور تھے کہ دوسرا طریق کار اختیار کریں کیونکہ انھیں تہذیب و شائستگی اور حسن معاشرت سکھانے کے لیے مذہبی بحثوں میں بھی الجھنا پڑتا تھا۔ گویا یہاں ایک ادیب کے قلم ہی کی نہیں بلکہ ایک مصلح کے ذہن اور ایک خطیب کے انداز خطابت کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس آرزو کے ساتھ ہی حالات کی مجبوری انھیں اس حقیقت کے تسلیم کر لینے پر مجبور کر رہی تھی۔"پس ہندوستان میں صرف اسٹیل اور اڈیسن ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مقدس لوتھر کی بھی بہت بڑی

حاجت ہے "گویا وہ محض ادبی طریق کار پر انحصار کر کے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اسٹیل اور اڈیسن ادیب پہلے تھے اور مصلح بعد میں، وہ زندگی کے تماشائی بن کر اور اپنے معاشرتی ماحول کی قباحتوں کے دلچسپ مرقعے پیش کر کے اصلاح کا فریضہ انجام دے سکتے تھے۔ لیکن سرسید تو خود تماشا گاہ حیات کے ایک اہم کردار بنے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اگر مصلح پہلے تھے اور ادیب بعد میں تو یہ ان کے حالات کی مجبوری تھی۔ ان حالات نے ایک ادیب ہم سے چھین لیا اور ایک مصلح ادیب ہمیں دے دیا۔ تاہم اس مصلح ادیب کی اُردو میں یہ حیثیت مسلم ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے مضمون نگاری کی اور اُردو ادب کو چند ایسے مضامین بھی دیے جنھیں باقاعدہ ادبی مضمون کہا جا سکتا ہے۔

جہاں تک سرسید کے دوسرے عام مضامین کا تعلق ہے، جو تہذیب اخلاق کے سلسلے میں لکھے گئے، یہ کسی جذباتی تحریک یا موڈ کے بجائے کسی نہ کسی اخلاقی مسئلے کی تلقین کی خاطر لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں مصلحانہ انداز میں مختلف اخلاق مسائل کو "خوفناک" سنجیدگی کے ساتھ مادی منفعتوں اور مضرتوں کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ زندگی کے ایسے دلچسپ مرقعے پیش کرنے کے بجائے کہ جنھیں دیکھ کر ہمارے ضمیر کا حاسئہ اخلاق بیدار ہو اور ہم خود ہی نیک و بد میں تمیز کر کے راہِ راست کو اختیار کریں سرسید اخلاقی تصورات زیادہ پیش کرتے ہیں اور عقل و منطق کے ذریعے نفع اور نقصان کا احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک معلم اخلاق کا فریضہ تو انجام دیتے ہیں جو دلائل و براہین سے ذہنوں کو مرعوب کرتا ہے لیکن ایک ادیب کے طریق کار کو پس پشت ڈال دیتے ہیں جو دلوں کی تسخیر کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کے بیشتر مضامین مقصدیت اور خشک منطقیت سے اتنے گراں بار ہو گئے ہیں کہ انھیں پڑھنے والا قطعاً کوئی راحت محسوس نہیں کرتا۔ انھوں نے اڈیسن کی پیروی کرتے ہوئے اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈالنے کے عزم کا اظہار تو کیا ہے لیکن یہ خوش طبعی ان کے مضامین میں کہیں نظر نہیں آتی۔ شاید ان کے مزاج میں خوش طبعی کا عنصر موجود بھی نہیں تھا اگر کچھ نوجوانی میں تھا بھی (جیسا کہ مولانا حالی کا خیال ہے) تو ۱۸۵۷ء کے بعد ان کی مصلحانہ شخصیت اس پر اتنی غالب آگئی تھی کہ اس کا شائبہ تک بھی کہیں ان کی تحریروں میں نہیں ملتا۔ نکتہ آفرینی (wit) کا جوہر ان میں ضرور موجود تھا لیکن مقصد اور تلقین اس پر بھی اتنے غالب تھے کہ اس کے اظہار کے مواقع کم ہی آتے ہیں۔ معاشرتی قباحتوں اور حماقتوں پر طنز وہ کرتے ہیں لیکن اس طنز میں بھی لطافت کم ہوتی ہے زہرناکی اور تضحیک کا رنگ زیادہ ہوتا ہے۔ ان باتوں کا یہ نتیجہ ہے کہ سرسید کے یہ مضامین اس دلکشائی اور مسرت افزائی سے محروم ہو گئے ہیں جو ایک ادبی مضمون کی بنیادی شرط ہے۔ (22) سرسید کی مضمون نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> "سرسید کے مضامین میں زندگی کے نقشے کم ہیں، تصورات زیادہ ہیں ان میں انسانی زندگی کے دلچسپ اور خیال انگیز مناظر نہیں۔ انھوں نے اکثر اعمال انسانی کے خواص پیش کیے ہیں اور اُن پر اخلاقی تبصرے کیے ہیں جن میں ہر جگہ عقل اور منطق کو متصرف بنایا ہے مگر خیال کو بیدار نہیں کیا۔ عقل کی اس کارفرمائی اور قہرمانی سے بچارے تخیل کو آزادی سے چلنے پھرنے کی معمولی فرصت بھی میسر نہیں ہوتی۔ سرسید کہنے کو تو ''نیچری'' تھے مگر وہ ان مضامین میں نیچر کے نہایت ہی محدود دائرے میں گھومتے رہے۔ انھوں نے نیچر کے ان وسیع تر سبزہ زاروں اور خوش نما مرغزاروں پر نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، جو انسان کی ذات سے باہر کائنات میں ہر جگہ موجود ہیں اور جس کے ذرّے ذرّے میں جمال اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ ان کی نیچر عقلی'' اصول بندی'' کا نام ہے، اس سے آگے کچھ نہیں۔ مگر ہاں ـــــ ان کا مضمون امید کی خوشی، گزرا ہوا زمانہ اور سراب حیات اس سے مستثنیٰ ہے جس میں زندگی کے مناظر بھی ہیں اور مجرد کیفیتوں کی تجسیم بھی ہے۔ اس کے علاوہ تخیل کے لیے بھی گلگشت کے کافی مواقع نکل آئے ہیں۔" (23)

سرسید کے مضامین کا اُسلوبِ نگارش بہت حد تک ان کے اس تصور اسلوب کے مطابق ہے "کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسرے کے دل میں پڑے، تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ "یعنی انھوں نے جو کچھ لکھا خلوص دل سے لکھا، اور قلب کی اس سچائی سے اُن کی تحریر میں تاثیر کی صورت پیدا ہوئی۔ بایں ہمہ یہ مسئلہ بحث طلب ہے کہ ادبی لحاظ سے اُن کے اسلوب میں جاذبیت کس حد تک ہے؟ مولانا حالی نے "حیاتِ جاوید" میں سرسید کے اسلوب کی تین خصوصیات بیان کی ہیں۔ (۱) سادگی (۲) بے تکلفی اور بے ساختگی (۳) مدعا نویسی، اور انھی خصوصیات کے مجموعے کو انھوں نے سرسید کا نیچرل طرزِ بیان قرار دیا ہے۔ سرسید کے مضامین میں یہ خصوصیات تو موجود ہیں لیکن اس نیچرل طرزِ بیان کو ادبی نقطۂ نظر سے حسن و خوبی کا حامل قرار دیتے ہوئے ذرا تامل ہوتا ہے۔ "تہذیب الاخلاق" کے اجرا کے ساتھ ہی سرسید ایک خاص تہذیبی نظریے کے نقیب بن کر منظر عام پر آئے تھے اور اپنے ان نظریات کو پھیلانے کا جوش قدرتی طور پر اُن میں موجود تھا۔ اپنے تہذیبی نظریات کی تبلیغ و اشاعت کی خاطر وہ اپنی تحریروں میں ترغیب و تلقین سے کام لیتے تھے اور اس سلسلے میں اضطرار و اضطراب کی کیفیت بھی ان پر طاری ہو جاتی تھی جس کے نتیجے میں وہ اپنی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3, 2024

بات بھر طور کہہ گزرتے تھے۔اس ہیجانی کیفیت اور کم فرصتی نے انھیں اس بات کا بہت کم موقع دیا کہ وہ اپنی تحریر کو ادبی غور وپرداخت کے اعتبار سے بھی دیکھیں۔حالی نے اس کی توجیہ اس مثال سے کی ہے کہ "اُن کی حالت تو اُس بے قرار آدمی کی طرح تھی جو گھر میں آگ لگی دیکھ کر بے تابانہ ہمسایوں کو آگ بجھانے کے لیے پکارتا ہے۔"یعنی انھیں وہ فرصت وفراغت (Leisure) میسر نہیں تھی کہ مناسب لفظوں کے انتخاب اور دروبست پر توجہ کرتے، فقروں کی شیرازہ بندی چست کرتے اور اس طرح اپنی تحریروں میں حسن ولطافت کا وہ رنگ پیدا کرتے جو ادبی لحاظ سے ضروری ہوتا ہے۔سرسید کی تحریریں بے ساختہ تو ضرور ہیں لیکن صناعتی تکمیل سے محروم ہیں۔ان میں ترکیبوں کا بھدا پن، لفظوں کا عامیانہ پن، نحوی ساخت سے بے اعتنائی، فقروں کی طوالت اور حروف ربط وعاطفہ کی بے آہنگ تکرار انگریزی لفظوں کا بے ضرورت استعمال جابجا پایا جاتا ہے جس سے وہ اکثر بے لطف وبے کیف ہو جاتی ہیں۔ تا ہم جن مضامین کو انہوں نے نسبتاً صبر وسکون کے ساتھ لکھا ہے اُن میں اسلوب نگارش خوشگوار بھی ہے اور حسن ولطافت کا حامل بھی ہے۔(24)

اردو مضمون نگاری کے ارتقا میں دوسرا اہم سنگِ میل "اودھ پنچ" اخبار ہے۔اودھ پنچ اردو کا پہلا اخبار ہے جس نے صحافت کو مغربی تنقید کے طور پر برتا۔ علی گڑھ تحریک کے علمبردار "تہذیب الاخلاق" کے ردِ عمل کے طور پر "اودھ پنچ" 1877ء میں جاری ہوا۔اگرچہ اس کے اجرا کا بنیادی مقصد سرسید احمد خان کے سیاسی اور سماجی نظریات کا ظریفانہ انداز میں انحراف تھا لیکن ہم اسے یہاں اردو مضمون نگاری کے ارتقا کے طور پر بیان کر رہے ہیں نہ کہ سیاسی مخالفت یا کسی تحریک کے ردِ عمل کے طور پر۔اودھ پنچ کے روحِ رواں منشی سجاد حسین تھے۔ان کے علاوہ جن ادبا نے اس پلیٹ فارم سے اردو مضمون نگاری کو پروان چڑھایا ان میں مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، احمد علی شوق، نواب سید محمد آزاد، جوالا پرشاد برق اور احمد علی کسمنڈوی کے نام اہم ہیں۔اودھ پنچ میں چھپنے والے مضامین کو ہم دو درجوں میں منقسم کر سکتے ہیں: ایک معاشی وسماجی موضوعات، دوسرے سیاسی موضوعات۔ان ادبا میں سے منشی سجاد حسین، جوالا پرشاد برق اور نواب سید محمد آزاد بکثرت سیاسی مضامین لکھا کرتے تھے۔باقی ادبا کا زیادہ تر رجحان معاشی اور سماجی مسائل کو اجاگر کرنے کی طرف تھا۔ان ادبا میں سے نواب سید محمد آزاد کے مضامین اودھ پنچ کے علاوہ "اکمل اخبار" اور "اخبار الاخبار" میں بھی شائع ہوتے رہے۔ان کے مضامین میں بھی اصلاحی رنگ زیادہ نمایاں تھا۔ان کے خطوط کی طرز کے مضامین کے مجموعے "خیالاتِ آزاد" کو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے 1967ء میں از سرِ نو مرتب کیا اور اس پر ایک جامع مقدمہ بھی تحریر کیا۔اس مقدمے میں انھوں نے سید محمد آزاد کے مضامین کے اُسلوبِ نگارش کے نمایاں اوصاف سلاست، روانی، بے ساختگی اور شگفتگی کو مفصل بیان کیا ہے۔

غرض "اودھ پنچ" کے پلیٹ فارم سے چھپنے والے مضامین نے اردو میں مضمون نگاری کی نشو ونما کو باثروت کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: "تہذیب الاخلاق" کی طرح "اودھ پنچ" کی یہ خدمت بھی آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے کہ اردو نثر کو سادگی، سلاست، روانی اور بے تکلفی کے ساتھ ساتھ ادبی حسن ولطافت اور دلکشی وشگفتگی سے ہم کنار کرنے میں اس نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔(25)

اردو مضمون کے ارتقا میں سرسید کے ردِ عمل کے طور پر "اودھ پنچ" میں لکھنے والے ادبا کے علاوہ شبلی نعمانی ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے ہندوستانیوں کے سیاسی اور اقتصادی شعور کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے زیادہ تر مضامین سیاسی، مذہبی اور تاریخی موضوعات پر مبنی ملتے ہیں۔اس حوالے سے ان کے مضامین "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم"، "مدرسے اور دار لعلوم"، "قدیم تعلیم"، "تعلیم قدیم وجدید"، "یورپ اور قرآن"، "غیر قوموں کی مشابہت"، "فلسفۂ یونان اور اسلام" اور "معرکہ مذہب وسائنس" وغیرہ اردو مضمون نگاری کے ارتقا میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ان کے اسلوبِ نگارش میں سنجیدگی، متانت اور منطقی استدلال کے پہلو نمایاں ہیں۔ شبلی نعمانی کے بعد اردو میں مضمون نگاری کے حوالے سے دوسرا اہم نام ریاض خیر آبادی کا ہے۔ان کے مضامین "اودھ پنچ" اور "دل گداز" میں شائع ہوتے رہے۔وہ سرسید احمد خان کے نظریات کے سخت مخالف تھے۔اس حوالے سے "عورت اور پردہ"، "چٹکیاں اور گدگدیاں" اور مالوجی کا لکچر علی گڑھ میں"، نئی پود کے مفسر" ایسے مضامین ہیں جو ان کے سماجی تصورات کی نمائندگی کرتے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے ہلکے پھلکے نشاطیہ انداز میں بھی مضامین تحریر کیے ہیں۔جن میں "دیوانے کا خواب"، "حلقہ دام خیال"، "نظارہ اور گلچین"، "خمخانہ جاوید" اور "سرمایہ داران زبان" کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

اردو مضمون نگاری میں ایک رجحان رومانیت کا بھی رہا ہے۔اس رجحان کے علم برداروں میں سجاد انصاری، مہدی افادی، سجاد ظہیر اور نیاز فتح پوری کے نام اہم ہیں۔ان ادبا نے ادب برائے ادب کے فلسفے کو اپناتے ہوئے مغربی ادبا کے تتبع میں جمالیاتی اقدار کو ادب کا حصہ بنایا۔ مغرب کے جن معروف مفکروں کے خیالات سے انھوں نے استفادہ

کیاان میں روسو، گوئٹے، بائرن، ٹینی سن، کارلائل، رسکن، ڈکنز وغیرہ کے نام اہم ہیں۔اسی رجحان کا ایک اہم اور نمائندہ نام سجاد حیدیلدرم کا ہے انھوں نے کلاسیکت اور رومانویت ،دونوں رنگوں کی امیزش سے مضمون نگاری کو فروغ دیا۔ان کے مضامین میں ہمیں کلاسکیت کا میلان اور رومانویت کے رنگوں کے علاوہ ترقی پسند تحریک کے عناصر بھی دکھائی دیتے ہیں۔انھوں نے ترکی کے رومانوی ادیبوں کا تتبع کرنے کے ساتھ ساتھ ترکی کے ترقی پسند ادیبوں خالدہ ادیب، نامق کمال اور احمد حکمت کے بہت زیادہ اثرات قبول کیے۔یلدرم کے مضامین "موت "اور "اگر میں صحرا نشین ہوتا" میں ان کے افکار کو دیکھا جاسکتا ہے۔

اردو مضمون نگاری کے ارتقامیں رومانوی رجحان کے بعد ایک لہر تاریخی اور سیاسی مضامین کی بھی نظر آتی ہے۔اس رجحان کے لکھنے والوں میں عبدالحلیم شرر، مولانا محمد علی جوہر، ظفر علی خان اور ابوالکلام آزاد کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ شرر کا دور ایک عبوری دور تھا۔ لکھنو کی محفلیں دم توڑ چکی تھیں اور سیاسی انقلاب کے نورے لگ رہے تھے۔شرر کا ادبی ذوق اس کے سماج کی پیداوار تھا اور وہ اس سماج سے پوری طرح متاثر تھے۔وہ اپنے ناولوں میں تمہید کے طور پر تاریخی مضامین لکھتے تاکہ قاری ناول پڑھنے سے پہلے اس کے تاریخی پس منظر سے واقف ہو جائیں۔ان کے مضامین کے موضوعات زیادہ تر تاریخی، جغرافیائی، اور اصلاحی ہوتے تھے۔اس کے علاوہ انھوں نے رومانوی اور شاعرانہ موضوعات پر بھی کسی قدر مضامین تحریر کیے ہیں۔شرر کے افکار کو سمجھنے کے لیے ان کے مضامین "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ"، "دارالخلافت قرطبہ"، "خونی پھٹے"، "ایک اگلا بے گنا ملزم"، "وفائے عہد"، "روحانی جاسوس"، "یورپ کے بانکے نائٹ ٹیلرز"، "گرج یا چر گھس" اور "روح" کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔مولانا محمد علی جوہر نے بھی ہندوستانی معاشرے کی سیاسی اور ذہنی بیداری کے لیے مضامین تحریر کیے۔انھوں نے اپنے مضامین میں مسلمانوں کو سیاست، مذہب اور سماج کے حوالے سے عتدال کا سبق دیا۔ ان کے انگریز مخالف نظریات ان کے مضامین میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ان کے مضامین کا اسلوب سادگی اور سلاست پر مبنی ہے۔اسی طرح ظفر علی خان کے مضامین بھی سیاسی، اسلامی تاریخ اور ثقافتی رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ کانگرس، تحریکِ خلافت، تحریکِ احرار، اتحادِ ملت اور مسلم لیگ کے روح رواں رہ چکے تھے۔ان کے مضامین زیادہ تر "زمیندار" میں چھپتے رہے ہیں۔ "وقائع خلیفہ واثق باللہ عباسی"، "الف لیلی کا یورپی بچہ"، "سومنات اور محمود"، "اسلام اور غلامان" وغیرہ مضامین مثال کے طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ شگفتگی اور سلاست ان کے اسلوب کی نمایاں خوبی ہے۔اس رجحان کے اہم مضمون نگار مولانا ابوالکلام آزاد کی انشاپردازی کے نمونوں کے لیے ان کے اخبار "الہلال" اور "البلاغ" کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔انھوں نے زیادہ تر مضامین مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد پید کرنے کے لیے تحریر کیے۔ان کے مضامین بھی سیاسی اور سماجی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔

اردو مضمون نگاری میں لطیف رجحان کے حوالے سے ناصر علی، خلیقی دہلوی، یوسف حسن، میاں بشیر احمد، عبدالعزیز فلک پیما، اختر جونا گڑھی، جوش ملیح آبادی اور حجاب امتیاز علی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ان ادبا کے مضامین کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حسن، عشق، انسانیت، مظاہرِ قدرت غرض ہر طرح کے موضوعات کو لطیف انداز میں بیان کیا ہے علاوہ ازیں ان مضامین میں رجائیت کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔اسی دور میں اسلامی موضوعات پر مضامین لکھنے والوں میں سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ان حضرات نے خالص مذہبی جذبے کے تحت مختلف اسلامی موضوعات و مسائل پر مضامین تحریر کیے۔اگرچہ ان کے ادبی موضوعات پر بھی مضامین ملتے ہیں لیکن ان دونوں ادبا کا مضمون نگاری کی تاریخ میں زیادہ معتبر حوالہ اسلامی مضامین ہی ہیں۔

سماجی اور اصلاحی مضامین کے تناظر میں دیکھا جائے تو میاں محمد شاہدین، سلطان حیدر جوش اور نسائی کے نام سامنے آتے ہیں۔ان ادبا کے مضامین سماجی، معاشی، اصلاحی اور طبقۂ نسواں کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔خاص طور پر نسائی کے ہاں ہمیں طبقۂ نسواں اور اس کے مسائل کے متعلق موضوعات زیادہ نظر آتے ہیں۔ درج بالا تینوں ادبا کے مضامین میں طنز و ظرافت کا انداز بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ علاوہ ازیں ان ادبا کی مضمون نگاری نہایت لطیف اور ہلکے پھلکے انداز کی ہے۔اردو مضمون نگاری کے ارتقا میں ایک رجحان فلسفیانہ مضامین کی نمائندگی کرتا ہے۔اس رجحان کے لکھنے والوں میں نظم طباطبائی، حسن نظامی، عبدالماجد دریابادی اور ڈاکٹر عابد حسین کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ان مضمون نگاروں کے ہاں فلسفہ، تاریخ، منطق، اخلاقیات، تصوف، ادب غرض تمام موضوعات پر مضامین ملتے ہیں۔ان ادبا کے مضامین کا اندازِ تحریر زیادہ تر سنجیدہ اور علمی ہونے کے باوجود سادگی اور حقیقت پسندی کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

اردو اصنافِ ادب میں طنز و مزاح کا رجحان ایک معتبر حیثیت رکھتا ہے۔اردو مضمون نگاری میں اس کے اولین نقوش "اودھ پنچ" کے لکھنے والوں کے ہاں نظر آتے ہیں۔اردو مضمون میں اس رجحان کو تقویت دینے میں جن ادبا نے خاص کردار ادا کیا ان میں محفوظ علی بدایونی، فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، عرش

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3, 2024

ملسیانی اور غلام احمد فرقت کا کوروی کے نام شامل ہیں۔انھوں نے سماجی خامیوں، اخلاقی بدعنوانیوں اور معاشرتی برائیوں کو شگفتہ، سلیس، بے ساختہ اور مزاحیہ انداز میں تحریر کیا ہے۔ان ادبا میں رشید احمد صدیقی کا نام اردو کے مزاح نگاروں میں معیار کے اعتبار سے سرِ فہرست ہے۔ سیدہ جعفر ان کے مضامین کے حوالے سے انھیں کچھ اس انداز میں خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں:

"رشید احمد صدیقی نے مزاحیہ انشائیوں کے علاوہ ایسے مضامین بھی لکھے ہیں جن میں مرقع کشی کے خوبصورت نمونے موجود ہیں "گنج ہائے گراں مایہ" میں مرقع کشی نگاری کی بہت سی اہم خصوصیات موجود ہیں۔رشید احمد صدیقی نے اپنے زمانے کی بعض اہم شخصیتوں کی سیر توں کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے عادات، اطوار، ڈیل ڈول، حلیے اور پسند و ناپسند کی ایسی متحرک اور گویا تصویریں کھینچی ہیں جو اردو ادب میں ایک عرصے تک مدھم نہ ہو سکیں گی۔"(26)

طنز و مزاح کے حوالے سے اردو مضمون نگاری کے ارتقا میں رشید احمد صدیقی کی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔انھوں نے اردو مضمون میں طنز و مزاح کو ایک مستقل حیثیت دینے میں اہم کردار ادا کیا۔اردو کے مزاحیہ مضامین لکھنے والوں میں ایک اہم نام پطرس بخاری کا بھی ہے جن کے تذکرے کے بغیر اردو مزاح نگاری کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ ان کے مضامین تعداد کے لحاظ سے کم ہیں لیکن اس کے باوجود معیار میں کہیں زیادہ ہیں۔ مشرق و مغرب کا امتزاج لیے ہوئے ان کے مضامین میں طنز کی جو کاٹ ملتی ہے وہ دوسرے مزاح نگاروں کے ہاں نظر نہیں آتی۔ان کے مضامین میں طنز و ظرافت کی ملی جلی کیفیتیں ملتی ہیں۔مثال کے طور پر ان کے مضامین "مرید پور کا پیر" اور "مرحوم کی یاد میں" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔غرض اردو مضمون نگاری کے ارتقا میں مزاحیہ مضامین کی مسلم حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔

مضمون نگاری کی روایت کے فروغ اور مقبولیت میں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ پختگی اور سنجیدگی نظر آتی گئی۔اس ضمن میں اردو کے بعض اہم ادبی رسائل خاص طور پر "مخزن"، "زمانہ"، "اردوے معلیٰ"، "الہلال"، "البلاغ"، علی گڑھ میگزین"، "ہمایوں"، "اردو"، "نگار"، "ادبی دنیا"، "نیرنگ خیال"، "ساقی"، "ادبِ لطیف"، "سب رس"، "آج کل"، "افکار"، "نیا دور"، "نقوش"، "صحیفہ"، "فنون"، "سیپ"، اور "اوراق" وغیرہ کا کردار لائقِ تحسین ہے۔ان رسائل کے ذریعے تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے مضامین تحریر کرنے والوں کو ایک پلیٹ فارم میّسر آگیا۔اس حوالے سے صدر یا جنگ شیروانی، وحید الدین سلیم، عبدالرحمٰن بجنوری، مولوی عبدالحق، برج نارائن چکبست، برج موہن دتاتریہ کیفی، فراق گورکھ پوری اور خواجہ احمد فاروقی جیسے ادبا کے نام نظر آتے ہیں جنھوں نے اردو مضمون نگاری کے ارتقا میں سنجیدہ اور علمی نوعیت کے مضامین کو فروغ دیا۔

تنقیدی مضامین کے حوالے سے ایک اہم دور ترقی پسند تحریک کا ہے۔اس تحریک کے علمبرداروں نے بھی اردو مضمون نگاری کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔اس حوالے سے مجنوں گورکھ پوری، اختر حسین رائے پوری، احتشام حسین، آل احمد سرور، ممتاز حسین، اختر اورینوی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔جس طرح تحریکِ علی گڑھ کے علمبرداروں نے مضمون نگاری کی صنف کے ذریعے اپنے تہذیبی اور ادبی مشن کی تکمیل کی، بعینہٖ ترقی پسند تحریک نے اس صنف کے ذریعے لوگوں کو رومانویت سے باہر نکال کر حقیقت نگاری کو فروغ دیا اور حقیقت نگاری(Realism)، رمزیت (Symbolism)، نیچرازم (Naturalism)، سماجی حقیقت نگاری(Social Realism) جیسے میلانات کے ذریعے اردو مضمون نگاری کو ایک نئی اور توانا جہت عطا کی۔ محققین اور ناقدین کو تحقیق و تنقید کی وضاحت اور تشریح کے لیے مضمون نگاری کی صنف کے ذریعے ایک بہترین پلیٹ فارم میسر آگیا اور مضامین کی صورت میں عالمی سطح کے مباحث کو زیرِ بحث لایا جانے لگا۔اس دور سے مضمون نگاری کی صنف کو ترجیحاً سنجیدہ اور علمی مباحث کو پیش کرنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اردو مضمون نگاری کے حوالے سے ادبی اور علمی رسائل کے علاوہ پاکستان اور بھارت کی مختلف جامعات اور علمی و ادبی اداروں کے تحقیقی مجلّات کا کردار نہایت اہم ہے۔ان مجلّات میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے اردو کی کم و بیش تمام اصنافِ ادب پر تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں۔اردو زبان و ادب کے کم و بیش تمام محققین اور ناقدین ان مجلّات میں اپنے تحقیقی و تنقیدی نظریات، مضامین کی صورت میں شائع کرواتے ہیں۔اردو مضمون نگاری کے درج بالا ارتقائی جائزے سے نمایاں ہے کہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں اس صنفِ ادب نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔بقول سیدہ جعفر:

"مضمون نگاری کو یہ اولیت حاصل ہے کہ دوسری اصنافِ نثر سے پہلے اس نے حیات پرور اور ترقی پسند رجحانات کی ترجمانی کی "مضمون" میں اظہار کے پیکروں کو کسی خاص پابندی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اس لیے خیال اپنی پوری جامعیت اور پہنائی کے ساتھ ظاہر ہو سکتا ہے۔"(27)

حوالے:

(1) Walker Hugh, The English Essay and Essayists, London, J.M Dent & Sons, LTD, 1915, P 1.

(2) Ibid, P 1

(3) The Encyclopedia Britannica, 11th (Eleventh) Edition, Chisholm, Hugh, ed., Cambridge University Press, Cambridge, 1910,

(4)جعفر، سیدہ، اردو مضمون کا ارتقا، حیدر آباد، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، بھارت، 1972ء، ص 14

(5)ذوالفقار، غلام حسین، مضامینِ سرسید: منتخبات تہذیب الاخلاق، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 1993ء، ص ز

(6)ایضاً، ص ح

(7)ایضاً ص ط

(8) Walker Hugh, The English Essay and Essayists, London, J.M Dent & Sons, LTD, 1915, P 3

(9)ذوالفقار، غلام حسین، مضامینِ سرسید: منتخبات تہذیب الاخلاق، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 1993ء، ص ط، ی

(10) قدوائی، صدیق الرحمن، ماسٹر رام چندر: قدیم دہلی کالج کی ایک اہم شخصیت، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، بھارت ء، ص ۷۰

(11)جعفر، سیدہ، اردو مضمون کا ارتقا، حیدر آباد، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، بھارت، 1972ء، ص 29

(12) قدوائی، صدیق الرحمن، ماسٹر رام چندر: قدیم دہلی کالج کی ایک اہم شخصیت، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، بھارت ء، ص ۱۵۵ تا ۱۵۸

(13) ذوالفقار، غلام حسین، مضامینِ سرسید: منتخبات تہذیب الاخلاق، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 1993ء، ص ل

(14) قدوائی، صدیق الرحمن، ہندوستان میں فکری و تہذیبی اصلاح کا آغاز اور ماسٹر رام چندر، مقدمہ: خواجہ احمد فاروقی، انجمنِ ترقیِ اردو (ہند) نئی دہلی، بھارت، 2007ء، ص 52

(15)ذوالفقار، غلام حسین، مضامینِ سرسید: منتخبات تہذیب الاخلاق، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 1993ء، ص ن

(16)جالبی، جمیل، تاریخِ ادبِ اردو: جلد چہارم، لاہور، مجلسِ ترقیِ ادب، 2015ء، ص 191

(17)جعفر، سیدہ، اردو مضمون کا ارتقا، حیدر آباد، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، بھارت، 1972ء، ص 39

(18)ایضاً، ص 40

(19)ایضاً، ص 58

(20)ذوالفقار، غلام حسین، مضامینِ سرسید: منتخبات تہذیب الاخلاق، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 1993ء، ص ن، س

(21)ایضاً، ص ع، ف

(22) ایضاً۔ ص ق، ر، ش

(23)عبداللہ، سید، "سرسید کی مضمون نگاری"، مشمولہ: دستور، جلد 3، شمارہ 4، لاہور، 1954ء، ص 94

(24)ذوالفقار، غلام حسین، مضامینِ سرسید: منتخبات تہذیب الاخلاق، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، 1993ء، ص ث، خ

(25)ذوالفقار، غلام حسین، خیالاتِ آزاد، مرتب، لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب، 1967ء، ص 16

(26)جعفر، سیدہ، اردو مضمون کا ارتقا، حیدر آباد، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، بھارت، 1972ء، ص 193

(27)ایضاً، ص 237

❖❖❖